POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 July 2025, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 86 واں سال

Date of Publication: 23-07-2025 • Price: 5/- • 1-7 August 2025 • Issue: 29 • Vol:84

یکم تا ۷/اگست ۲۰۲۵ء • شمارہ:۲۹ • جلد:۸۴

صحتِ زبان (۲۹)

رؤف پاریکھ

☆ بِ، بَ، بہ اور با

کسی اخبار میں ایک ترکیب دیکھی 'لمحہ بالمحہ'۔ لیکن یہ غلط ہے۔ درست ترکیب 'لمحہ بہ لمحہ' ہے، یعنی ہر لمحہ، لمحے لمحے میں، ہر لمحے پر (جو ہو رہا ہے اس کی تفصیل)۔ 'با' اور 'بہ' میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے۔ آیئے ذرا اس 'با' اور 'بہ' پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ بلکہ پہلے 'بِ' اور 'بَ' کو دیکھ لیا جائے کیونکہ بعض لوگ 'بِ' (زیر کے ساتھ) اور 'بَ' (زبر کے ساتھ) میں کوئی امتیاز نہیں کرتے بلکہ بعض حضرات جو ''جدید اردو املا'' کے شدت سے قائل ہیں اور الفاظ کو توڑ کر لکھنے پر زور دیتے ہیں وہ 'بِ' کو 'بہ' لکھتے ہیں اور مثلاً بحال کو بہ حال لکھنے پر بضد رہتے ہیں (بلکہ ان کے اپنے املا کے مطابق 'بہ ضد' رہتے ہیں)۔ چلیے یہ ان کا استحقاق ہے۔ لیکن ایسے بعض حضرات 'بِ' (زیر کے ساتھ) کو بھی توڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور املا کے علاوہ مفہوم کا بھی بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ دراصل 'بِ' (مکسور) عربی ہے اور 'بَ' (مفتوح)، جس کو 'بہ' بھی لکھا جاتا ہے، فارسی ہے۔

پہلے عربی تراکیب میں 'بِ' کو دیکھتے ہیں[1]۔ 'ب' ایک سابقہ ہے جو عربی سے اردو میں پہنچا ہے۔ 'ب' جب حرفِ جر کے طور پر عربی الفاظ کے ساتھ لگتا ہے تو اس کے نیچے کسرہ یعنی زیر لگتا ہے یعنی یہ 'بِ' ہو جاتا ہے اور اسے بعض عربی الفاظ کے ساتھ ملانے کے لیے 'بِ' کے بعد لامِ تعریف یعنی الف اور لام (ال) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ 'بِ' مختلف معنی میں آسکتا ہے، مثلاً:

۱۔ 'میں' کے معنی میں، جیسے: بِالاَقساط، یعنی اقساط میں، بِالآخر یعنی آخر میں۔

۲۔ 'ساتھ' کے معنی میں، جیسے: بِالاتفاق یعنی اتفاق کے ساتھ (متفق ہو کر)۔

۳۔ 'قسم' کے معنی میں، جیسے: بِاللہ یعنی اللہ کی قسم۔

۴۔ 'سے' کے معنی میں، جیسے: بِالخیر یعنی خیر سے۔

لفظ 'بِالکل' (جس کا املا آج کل کے بعض کند ذہن طالبِ علم 'بلکل' کرتے ہیں اور جو بالکل غلط ہے) بھی اسی طرح بنا ہے، یعنی بِ+ال+کُل، مطلب ہے پورے طور سے، مکمل طور پر۔

ان سب مثالوں میں 'ب' پر کسرہ یعنی زیر پڑھا جائے گا۔ یہ عربی میں بائے جارہ (یا باء جارہ) کہلاتا ہے اور اسے 'بہ' نہیں لکھا جا سکتا۔ جو لوگ اردو مرکبات کو توڑ کر لکھنے کے قائل ہیں انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ فارسی کے 'بَ' کو تو 'بہ' لکھا جا سکتا ہے لیکن عربی کے بِ یا بائے جارہ کو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا اور اسے 'بہ' لکھنا بالکل غلط ہوگا۔ 'بہ' کو دیکھیں تو یہ بھی حرفِ جر ہے لیکن یہ فارسی سے آیا ہے۔ 'بہ' کو مختصراً 'بَ' (یعنی زبر کے ساتھ) بھی لکھا جاتا ہے۔ اردو میں بطورِ سابقہ آتا ہے۔ شان الحق حقی نے 'فرہنگ تلفظ' میں لکھا ہے کہ 'بَ' حرفِ جر ہے اور 'بہ' کی تخفیف ہے۔ 'بَ' یا 'بہ' مختلف معنوں میں آتا ہے، جیسے:

۱۔ 'پر' کے معنی میں، جیسے: خاک بَسَر، مراد ہے جس کے سر پر خاک ہو (یعنی بہت پریشان اور غم زدہ)۔ اسی طرح بَحال یعنی حال پر (اپنی اصلی صورت یا پچھلی حالت پر)۔ اسی سے 'بحالی' کا لفظ ہے۔

۲۔ 'کے ذریعے/وجہ سے' کے معنی میں، جیسے: بَفضلِ خدا یعنی خدا کے فضل کی وجہ سے یا فضل کے ذریعے سے۔

۳۔ 'سے' کے معنی میں، جیسے: بَنامِ خدا یعنی خدا کے نام سے۔ بَجان و دِل یعنی جان اور دِل سے۔ بَحساب یعنی حساب سے۔

۴۔ 'ساتھ' کے معنی میں، مثلاً: بَخیریت یعنی خیریت کے ساتھ، بآسانی یعنی آسانی کے ساتھ۔

۵۔ 'میں' (ظرفی) کے معنی میں، مثال کے طور پر: بَظاہر یعنی ظاہر میں۔ بَخدمت یعنی خدمت میں۔ بَسلسلہ یعنی سلسلے میں۔ خاکم بَدہن یعنی میرے منھ میں خاک۔

۶۔ 'طرف' یا 'جانب' کے معنی میں، جیسے: رُو بَقبلہ یعنی چہرہ قبلے کی طرف۔ رُو بَرُو یعنی چہرہ چہرے کی جانب (گویا آمنے سامنے)۔

۷۔ 'قسم' کے معنی میں، مثلاً: بَخدا یعنی خدا کی قسم۔ بَربِ کعبہ یعنی ربِ کعبہ کی قسم۔

۸۔ 'مطابق' کے معنی میں، جیسے: بَقولِ شاعر یعنی شاعر کے قول کے مطابق۔

۹۔ 'ب' کبھی تسلسل یا کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے، جیسے: رنگ بَرنگ یعنی کثیر رنگوں کا۔ قدم بَقدم یعنی ہر قدم پر (گویا ساتھ ساتھ یا مسلسل)۔

۱۰۔ اتصال کے لیے، جیسے روز بَروز، دربَدر۔

ان سب مثالوں میں 'ب' پر زبر پڑھا جائے گا۔ البتہ ایک وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اب 'بہ' کو مختصراً 'بَ' لکھنے کی بجائے مکمل شکل یعنی 'بہ' لکھنے پر زور دے رہے ہیں، مثلاً 'بَحال' کو لازماً 'بہ حال' لکھتے ہیں یا 'بخیریت' کو 'بہ خیریت' ہی لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ عرض ہے کہ دونوں طرح سے درست ہے لیکن کچھ لوگ پرانے املا مثلاً بحال یا بحالی کے عادی ہیں اور انھیں 'بہ حال' بجائے بحال یا 'بہ حالی' بجائے بحالی عجیب سا لگتا ہے۔

بلکہ یوں بھی ہوا کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کراچی میں منعقد کی گئی جس میں انھیں اپنی منتخب تحریریں خود پڑھ کر سنانی تھیں۔ اس کے دعوتی کارڈ پر نسخ کے جلی حروف میں عنوان لکھا گیا 'بہ زبانِ یوسفی'۔ لیکن اس کی کتابت بہت بھدی تھی اور اضافت کا زیر بھی غائب تھا۔ جب یوسفی صاحب شہ نشین پر آئے تو انھوں نے ابتدائی کلمات میں یہ بھی کہا کہ کارڈ پر 'بہ زبان یوسفی' کچھ ایسے لکھا ہے کہ 'بدزبان یوسفی' پڑھا جاتا ہے۔ بظاہر تو یہ ازراہِ تفنن تھا لیکن اس طرح انھوں نے لطیف انداز میں نشان دہی بھی کی کہ 'بزبانِ یوسفی' لکھا جانا بہتر ہوتا۔ دراصل یوسفی صاحب اور ان جیسے (اور ہم جیسے بھی) دوسرے بہت سے بزرگ پرانے املا کے عادی ہیں جس میں 'بَ' کو ملا کر لکھا جاتا ہے اور اسے 'بہ' لکھا جائے تو انھیں الجھن ہوتی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ بزبانِ شاعر، لفظ بلفظ، بلحاظِ عہدہ، بمشکل، بحیثیتِ نقاد اور ان جیسی دیگر کئی تراکیب میں جو 'بَ' ہے اسے ملا کر لکھنا بعض لوگوں کے نزدیک بہتر ہے اور اسے الگ سے یعنی 'بہ' لکھنے سے بعض لوگوں کو الجھن ہوتی ہے، اگرچہ درست تو دونوں ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ 'بَ/بہ' ایک الگ سابقہ ہے اور اسے 'با' سے گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ دونوں فارسی سے اردو میں آئے ہیں۔ لیکن 'بہ' کی تخفیف شدہ صورت یعنی 'بَ' پر زبر ہے۔ نیز

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

یہ کہ یہ عربی کے 'بِ' (زیر کے ساتھ) سے الگ ہے۔

'ب' کے بجائے 'بہ' یعنی لفظوں کو توڑ کر لکھنے کے حامیوں میں رشید حسن خاں صاحب بھی شامل ہیں۔ لیکن انھوں نے جن الفاظ یا مرکبات کو 'بہ' سے لکھنے کی ہدایت کی ہے ان میں بہ دستور (بدستور)، بہ ہر حال (بہرحال) اور بہ صد ادب (بصد ادب) وغیرہ جیسے الفاظ یا مرکبات تو شامل انھوں نے کر ہی دیے البتہ اس ہدایت کے بعد کہ: ''' بہ' خواہ کسی معنی میں آئے اس کو عموماً علاحدہ لکھا جائے گا''[۲] (اس ''خواہ کسی'' اور ''عموماً'' کے تضاد کی داد دیجیے)۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ''البتہ چند الفاظ [کذا: 'مرکبات' چاہیے] ایسے ہیں جو مفرد لفظ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ان کو اس قاعدے سے مستثنا [کذا] سمجھا جائے گا، جیسے: بہم، بغیر، بعینہٖ، بفضلہٖ، بجز، بجائے''۔[۳]

یہ گویا اس بات کا اعتراف ہے کہ اردو میں 'بَ' کو ہمیشہ ملا کر ہی لکھا گیا ہے اور کچھ الفاظ کے اس پرانے املا یعنی ملا کر لکھے ہوئے املا کو بہر حال قبول کرنا ہی پڑے گا جس میں 'بَ' کو ملا کر لکھا جاتا ہے، جن کی مثالیں رشید صاحب نے بہم، بجز اور بجائے وغیرہ کی صورت میں دی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر بقیہ الفاظ کے پرانے املا یعنی ملا کر لکھے ہوئے املا کو قبول کرنے میں کیا قباحت ہے؟ یہ دو رنگی طالبِ علموں کے لیے الجھن کا باعث نہیں ہوگی؟

اس ''مختلف املا'' کی وجہ سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں شمس بدایونی صاحب نے ایک عمدہ مثال کے ذریعے ان کو بخوبی واضح کیا ہے، یعنی اگر 'بَ' کو 'بہ' لکھا جائے تو کیا خرابی ہو سکتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ تاریخی مادّوں سے سنہ برآمد کرنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ ابجد کے حساب میں حرف کے اعدادِ مکتوبی شمار کیے جاتے ہیں اور اگر کسی ایسے لفظ کا ستعمال کسی تاریخی مادّے میں کیا جائے (یعنی 'بَ' کے بجائے 'بہ' لکھا جائے) تو 'ہ' کے اضافے سے اس کی ابجدی قدر میں اضافہ کرنا ہوگا اور سال غلط ہو جائے گا۔[۴]

اس بات سے اہلِ علم تو بخوبی واقف ہیں لیکن یہاں طالبِ علموں کی رہنمائی کے لیے عرض ہے کہ 'ب' کی ابجدی قدر دو (۲) ہے اور 'ہ' کی پانچ (۵) یعنی اگر مصرعے میں 'بَ' لکھا جائے تو سال نکالتے وقت دو (۲) کا عدد شمار کریں گے لیکن 'بہ' لکھا جائے تو 'ب' کے عدد یعنی دو (۲) کے علاوہ 'ہ' کے بھی پانچ (۵) عدد مجموعے میں شامل ہوں گے اور میزان غلط ہو جائے گا، یعنی سال درست نہیں نکلے گا۔ اس ضمن میں شمس بدایونی صاحب نے اپنے اسی مقالے میں حامد حسن قادری کے دو مصرعوں کی مثال دی ہے جن سے ۱۹۴۸ کا سال برآمد ہوتا ہے اور دونوں مصرعوں میں لفظ ''بخیر'' آیا ہے۔ ان میں 'ب' کے دو عدد شمار کیے گئے ہیں لیکن اگر املا کی ''جدت'' (بلکہ بدعت) کے تحت اسے ''بہ خیر'' لکھا جائے تو 'ہ' کے پانچ عدد کا اضافہ کرنا ہوگا اور سال ۱۹۴۸ کے بجائے ۱۹۵۳ ہو جائے گا۔[۵]

املا اور تاریخ گوئی ہی کے ضمن میں شمس بدایونی صاحب نے ایک اور مثال دی ہے گو اس کا تعلق 'بہ' سے تو نہیں لیکن رشید حسن خاں صاحب کے تجویز کردہ املا کی ایک خرابی اس سے خوب واضح ہو رہی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کلبِ حسین خاں نادر کی کتاب ''تلخیصِ معلیٰ'' کا نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۲۸۰ ہجری کا سال نکلتا ہے لیکن انصار اللہ صاحب نے اس کو مرتب کر کے شائع کیا تو سرورق پر کتاب کا نام ''تلخیصِ معلا'' لکھا گیا (یعنی معلیٰ کے بجائے معلا) لیکن اس سے سال کے اعداد میں نو (۹) کی کمی ہو گئی (کیوں کہ اب 'ی' کے دس (۱۰) عدد کے بجائے الف کا ایک شمار کیا جائے گا) جس سے سال ۱۲۷۱ ہجری بن گیا۔[۶] انصار اللہ صاحب جیسے محقق سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی، ممکن ہے ناشرین نے جدید املا کی بدعت کو بروئے کار لاتے ہوئے نام میں تبدیلی کی ہو۔ لیکن اس سے تاریخی سال کا ستیاناس ہو گیا۔

گویا ''ب'' کو ملا کر لکھنا ہی بہتر ہے، کم از کم ایسے مواقع پر۔ شمس بدایونی صاحب بھی اسی کے قائل ہیں اور انھوں نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ نیز ہماری درخواست ہے کہ ادنیٰ، اعلیٰ اور معلیٰ وغیرہ کو ادنا، اعلا اور معلا وغیرہ لکھنے کی بدعت پر بھی غور کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے کہ ایسے مواقع پر 'بَ' کو ملا کر لکھنا چاہیے۔ لکھتے ہیں: ''جن الفاظ کی ابتدا میں حرف 'ب' بمعنیِ 'میں' یا 'ساتھ' آتا ہے وہاں اسے لفظ کے ساتھ ملا کر لکھا جائے، مثلاً: بحالِ بد، بنفسِ نفیس، مابدولت، بشگفت، بایں ہمہ (نہ کہ بہ حالِ بد، ما بہ دولت، بہ ایں ہمہ، وغیرہ)''۔[۷]

اب 'با' کو دیکھ لیتے ہیں۔ 'با' فارسی کا لفظ ہے اور حرفِ جر ہے۔ 'با' اردو میں بطور سابقہ آتا ہے۔ 'با' مختلف معنوں میں آتا ہے، جیسے:

۱۔ با 'والا' یا 'رکھنے والا' کے معنوں میں بھی مستعمل ہے، جیسے باوفا یعنی وفا والا، بااثر یعنی اثر رکھنے والا۔

۲۔ کبھی 'سے' کے معنی میں آتا ہے، بادلِ ناخواستہ یعنی اس دل کے ساتھ جو چاہتا نہ ہو (یعنی دل نہ چاہتے ہوئے)۔

۳۔ کبھی 'ساتھ/کے ساتھ' کے معنی میں آتا ہے، جیسے باادب یعنی ادب سے، ادب کے ساتھ۔

☆ 'بہ' اچھا کے مفہوم میں

'بَ' کو 'بہ' لکھنے سے ایک اور مغالطہ بھی ہوتا ہے۔ دراصل 'بہ' ایک الگ لفظ بھی ہے۔ فارسی میں اس کا تلفظ 'ب' مکسور اور ہائے ملفوظی کے ساتھ ہے لیکن 'بہ' کی 'ب' پر اردو میں بالعموم کسرۂ مجہول بولا جاتا ہے۔ 'بہ' کا مفہوم ہے: اچھا، عمدہ، شاندار۔ اس صفت (adjective) 'بہ' سے جب درجۂ تفضیلِ بعض (comparative degree) بناتے ہیں تو وہ 'بہ تر' (یعنی زیادہ عمدہ) بن جاتا ہے جسے اردو میں عموماً ملا کر یعنی 'بہتر' لکھا جاتا ہے (شاید ہائے ملفوظی کو واضح کرنے کے لیے)۔ اسی 'بہ' کا درجۂ تفضیلِ کُل (superlative degree) ہے 'بہ ترین' (یعنی سب سے عمدہ)، جسے اردو میں عام طور پر ملا کر یعنی 'بہترین' لکھا جاتا ہے۔ لیکن فارسی کا یہ 'بہ' جب دیگر تراکیب میں آتا ہے تو اس کو 'بہتر' اور 'بہترین' کے برعکس بالعموم ملا کر نہیں بلکہ توڑ کر لکھا جاتا ہے، مثلاً: ''دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیِ فتنہ انگیز'' میں 'بہ از' کو ملا کر 'بہاز' نہیں لکھا جاتا (طالب علموں کی خدمت میں عرض ہے کہ اس فارسی فقرے کا مطلب ہے: وہ جھوٹ جس میں صلح کی آمیزش ہو اس سچ سے بہتر ہے جس سے فتنہ اٹھے)۔ اسی طرح ناگفتہ بہ کی ترکیب ہے (اس کے لفظی معنی ہیں: نہ کہا جائے تو اچھا، مراداً: بہت برا، شرم ناک) اس میں بھی اچھا کے مفہوم میں 'بہ' کو الگ لکھا جاتا ہے۔[۸]

حواشی:

۱۔ ب، بہ اور با سے متعلق معلومات متعدد مآخذ سے منقول ہیں، مثلاً: اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد دوم (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۹ء)؛ نیز فرہنگِ تلفظ (مرتبہ شان الحق حقی) (اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان، ۲۰۲۲ء) (اشاعتِ نو)؛ سفارشاتِ اردو املا ۲۰۲۲ء (مرتبہ قومی مجلس برائے سفارشاتِ املا) (اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان، ۲۰۲۲ء)؛ حامد محمود راجا، با جارہ: تلفظ و املا کی اغلاط (مقام و ناشر ندارد، ۲۰۱۸ء)۔

۲۔ اردو املا (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۴۶۷ (دوسرا ایڈیشن)۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ دیکھیے شمس بدایونی کا مقالہ: حرف 'ب' بطور سابقہ اور وسطیہ، مشمولہ، مخزن، شمارہ ۴۶، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۴ء، قائد اعظم لائبریری، لاہور، ص ۳۶۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۷۔ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں املا کے معمولات، مشمولہ منتخب مقالات: اردو املا و رموزِ اوقاف (مرتبہ گوہر نوشاہی)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۸۶۔

۸۔ حامد محمود راجا، با جارہ: تلفظ و املا کی اغلاط، محولۂ بالا، ص ۱۳۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
A-337، بلاک 19، گلشنِ اقبال، کراچی، پاکستان
drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیوؤں کا ظہور (الوک اگروال/مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات و مضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری و تاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-

اُردو کی پہلی مزاح نگار خاتون: ڈاکٹر شفیقہ فرحت

مرضیہ عارف

آزادی کے بعد بھوپال کی خواتین نثر نگاروں میں صفیہ اختر کے بعد دوسرا بڑا نام ممتاز ادیبہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت کا ہے، جنھوں نے کہانی نویسی اور طنز ومزاح نگاری میں اپنا مقام بنایا ہے۔ وہ 26 اگست 1931 کو ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم پرائمری سے پانچویں کلاس تک ناگپور کے کانوینٹ اسکول سینٹ جوزف میں ہوئی، جو بچوں کی تعلیم کا معیاری ادارہ تھا۔ 1947 میں میٹرک کا امتحان دیا، بعد میں سی ،سی ، ڈبلیو کالج ناگپور سے 1951 میں بی اے کیا۔ وہ اپنے ذہنی رُجحانات کے مطابق پولیٹکل سائنس میں ایم اے کرنا چاہتی تھیں، لیکن خاندان کی مالی حالت نے اجازت نہیں دی تو 1954 میں ڈپلوما اِن جرنلزم کرلیا۔ اُنھیں کم عمری میں انگریزی اور اُردو زبانوں پر عبور حاصل ہوگیا تھا، لیکن اُردو میں پہلا مضمون 1951 میں شائع ہوا، یہ ڈراما نُما اِنشائیہ کے طرز پر تھا اور کالج میگزین میں اِس کی اشاعت ہوئی۔ اِسی زمانے میں اُنھوں نے کچھ عرصہ ناگپور سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے 'چاند' میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، بعد میں والد محمد رستم خاں کی مدد سے 1955 میں اپنا رسالہ 'کرنیں' نکالنے لگیں، یہ صرف بچوں کا رسالہ نہیں تھا بڑے بھی اِسے دل چسپی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اُس زمانے کے معروف ادیب مثال کے طور پر رضیہ سجاد ظہیر، راجہ مہدی علی خاں، سلام مچھلی شہری، ابنِ انشا، پرکاش پنڈت، نریش کمار شاد اور سراج انور وغیرہ کی تخلیقات اِس میں شائع ہوتی تھیں، خاص بات یہ ہے کہ ادیبوں کو اُن کی تخلیقات کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔

'کرنیں' مقبول رسالہ تھا، لیکن مالی وسائل کی کمی اِس کی مزید اشاعت میں مانع ہوئی تو اِسے بند کردیا گیا، بعد میں شفیقہ فرحت نے 1957 میں ناگپور یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا اور فوراً ہی اُن کا تقرر اُردو لکچرار کی حیثیت سے حمیدیہ کالج بھوپال میں ہوگیا، وہ ترقی کرکے صدر شعبۂ اردو کے عہدے تک پہنچیں۔ یہ وہی کالج ہے جس میں مجاز لکھنوی کی بہن اور جاں نثار اختر کی اہلیہ صفیہ اختر اُردو اُستاذ کی خدمت انجام دے چکی تھیں۔ شفیقہ فرحت نے اپنی صلاحیت سے کالج اور بھوپال کے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کی، اِسی دوران اُنھوں نے 'نظیر اکبر آبادی: ایک مطالعہ' موضوع پر تحقیقی مقالہ ہندی میں قلم بند کرکے جیواجی راؤ یونی ورسٹی گوالیار سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1991 تک ملازمت کرکے وہ سبک دوش ہوگئیں، 77 برس کی عمر میں جنوری 2008 میں بھوپال میں ہی اُن کا دمِ آخر ہوا۔ انتقال سے دوماہ پہلے کولہے کی ہڈی ٹوٹنے سے وہ صاحبِ فراش رہیں، شادی نہیں کی تھی، اولاد نہ ہونے سے احباب اور اسٹوڈنس ہی آخری زمانے میں اُن کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ اقبال مسعود اُن کی شادی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''پاکستان کے شہرۂ آفاق محقق مشفق خواجہ جب بھوپال تشریف لائے تو اُنھوں نے شفیقہ فرحت سے ایک انٹرویو لیا تھا، جب مشفق خواجہ نے شادی کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ اب کیا ارادہ ہے اور اُس وقت وہ پچاسویں موسمِ بہار سے گزر رہی تھیں تو اُنھوں نے تپاک سے جواب دیا:

میں محبت کی نگاہوں کو سمجھ سکتی ہوں
میرے معیار کے قابل کوئی پیغام تو دے

اور اگر آج کوئی مل جائے تو، سبحان اللہ اُن کا جواب تھا، جو ہنسی کے پسِ پردہ ایک آنسو کی طرح چمک رہا تھا، زندگی بھر اُن کی آنکھوں کو نمناک کرتا رہا۔''

(نئی کتاب، جنوری تا مارچ 2011، ص 177)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر ظفر الاسلام کا شفیقہ فرحت کی شادی کے بارے میں تجزیہ ہے:

''مردوں کی بنائی ہوئی اِس دنیا میں جہاں شادی کے بغیر عورت کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ شفیقہ فرحت نے پوری زندگی تنہا بسر کی اور یہ باور کرایا کہ عورت تنہا زندگی گزار سکتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ اُن کے لیے رشتوں کی کمی تھی، پنجاب کے ایک مشہور شاعر اِس اُمید میں بھوپال مع بوریے بست کے آگئے کہ شاید نظرِ کرم ہوجائے لیکن شفیقہ فرحت شادی کے بندھن میں قید ہوکر کسی کے تابع زندگی گزارنے کے لیے خود کو تیار نہ کرسکیں۔''

(ماہنامہ 'خواتین کی دنیا' نئی دہلی، ستمبر 2019، ص 5)

بھوپال شہر، جو باہر سے یہاں آنے والوں کو گلے لگانے میں بڑا فراخ دل واقع ہوا ہے، شفیقہ فرحت کو بھی یہاں اپنی جگہ بنانے میں دقت یا جانبداری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند خاتون تھیں اور بائیں بازو کے حلقوں سے قربت رکھتی تھیں، لیکن زبان وادب کے تعلق سے اُن کی فراخ دلی ورواداری کا اندازہ اِس سے ہوتا ہے کہ دین دیال وچار پرکاشن کے ادبی وثقافتی پروگراموں میں وہ ذہنی تحفظ کے بغیر شریک ہوجاتی تھیں۔ ایاز، فورم جو بھارتیہ جنتا پارٹی کا لٹریری ونگ تھا، اُس نے ترقی پسند ادیب وشاعر احسن علی خاں کی پاکستان سے بھوپال آمد پر اُن کے اعزاز میں 'ایک شام احسن علی خاں کے نام' ایک استقبالیہ رکھا تو اُس کی صدارت شفیقہ فرحت نے کی، انجمن ترقی اُردو مدھیہ پردیش کی وہ برسوں جنرل سکریٹری اور ترقی پسند مصنّفین کی نائب صدر رہیں، خواتین کی فعال ادبی وسماجی انجمن 'دھنک' کی بانی اور صدر تھیں، اُنھوں نے خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس جو چین میں ہوئی، بھوپال کی خواتین کی نمائندگی کی تھی۔

شفیقہ فرحت نے خواتین کے مسائل اُٹھانے اور بھوپال کے متوسط طبقے کی مسلمان لڑکیوں کو آگے بڑھانے میں جس سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اُس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ پُرانی نسل کے اکثر ذہنوں میں تازہ ہوں گے۔ اِسی طرح وہ ہر اُس تحریک، نظریہ اور عمل کا حصہ بنیں جو جہالت، عدمِ مساوات اور ناانصافی کے خلاف یہاں برپا ہوئی۔ وہ سماجی وفلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتی رہیں اور اِس کا سلسلہ ملازمت کے بعد بھی جاری رہا، جب اُن کا ہاتھ تنگ ہوگیا تھا۔

جہاں تک شفیقہ فرحت کی مزاح نگاری کا تعلق ہے تو اُن کو ہم پورے اعتماد کے ساتھ اُردو کی پہلی مزاح نگار ادیبہ کہہ سکتے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعے 'لو آج ہم بھی' کے ذریعے جو 1981 میں شائع ہوا، اُنھوں نے اِس صنفِ اِدب میں قدم رکھا اور اپنی صلاحیتوں سے بہت سوں کو چونکا دیا۔ اِس کے 15 مضامین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطری مزاح نگار ہیں۔ زبان کی سلاست وروانی کے علاوہ الفاظ کے مخصوص استعمال یا اشعار میں ردّ وبدل سے ایسا مزاح پیدا کرتیں کہ قاری بے ساختہ کبھی مسکرانے تو کبھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہوجاتے۔ اُن کے مضامین کا دوسرا مجموعہ 'رانگ نمبر' 1986 میں منظرِ عام پر آیا جب کہ تیسرے مجموعے 'گول مال' کی اشاعت 1988 میں ہوئی۔

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

آزادی کے بعد بھوپال کی خواتین نثر نگاروں میں صفیہ اختر کے بعد دوسرا بڑا نام ممتاز ادیبہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت کا ہے، جنھوں نے کہانی نویسی اور طنز و مزاح نگاری میں اپنا مقام بنایا ہے. وہ 26 اگست 1931 کو ناگپور میں پیدا ہوئیں. ابتدائی تعلیم پرائمری سے پانچویں کلاس تک ناگپور کے کانوینٹ اسکول سینٹ جوزف میں ہوئی، جو بچوں کی تعلیم کا معیاری ادارہ تھا. 1947 میں میٹرک کا امتحان دیا، بعد میں سی ، سی ، ڈبلیو کالج ناگپور سے 1951 میں بی اے کیا. وہ اپنے ذہنی رُجحانات کے مطابق پولیٹکل سائنس میں ایم اے کرنا چاھتی تھیں ، لیکن خاندان کی مالی حالت نے اجازت نہیں دی تو 1954 میں ڈپلوما اِن جرنلزم کرلیا. اُنھیں کم عمری میں انگریزی اور اُردو زبانوں پر عبور حاصل ہوگیا تھا، لیکن اُردو میں پہلا مضمون 1951 میں شائع ہوا، یہ ڈراما نُما اِنشائیہ کے طرز پر تھا اور کالج میگزین میں اِس کی اشاعت ہوئی. اِسی زمانے میں اُنھوں نے کچھ عرصہ ناگپور سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے 'چاند' میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، بعد میں والد محمد رستم خاں کی مدد سے 1955 میں اپنا رسالہ 'کرنیں' نکالنے لگیں، یہ صرف بچوں کا رسالہ نہیں تھا بڑے بھی اِسے دل چسپی کے ساتھ پڑھتے تھے. اُس زمانے کے معروف ادیب مثال کے طور پر رضیہ سجاد ظہیر، راجہ مہدی علی خاں، سلام مچھلی شہری، ابنِ انشا، پرکاش پنڈت، نریش کمار شاد اور سراج انور وغیرہ کی تخلیقات اِس میں شائع ہوتی تھیں ، خاص بات یہ ہے کہ ادیبوں کو اُن کی تخلیقات کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا.

اردو دُنیا

اساتذہ کے خالی عہدوں پر بحالی جلد

وزیرِ اعلا نتیش کمار نے TRE-4 امتحان کے جلد انعقاد کی ہدایت دی

پٹنہ (16 جولائی)۔ بہار میں اس سال ہونے والے اسمبلی انتخابات سے پہلے وزیرِ اعلا نتیش کمار نے بہار کے لوگوں کو روزگار کا بڑا تحفہ دیا ہے۔ وزیرِ اعلا نتیش کمار نے جلد از جلد اساتذہ کی تقرری کے امتحان کے انعقاد کا حکم جاری کیا ہے۔ اس کے بارے میں وزیرِ اعلا نتیش کمار نے ایکس پر جانکاری دی ہے۔ واضح رہے کہ اس امتحان میں خواتین کو بھی ریزرویشن کا فائدہ ملے گا۔ وزیرِ اعلا نتیش کمار نے ایکس پر بتایا کہ ہم نے محکمۂ تعلیم سے کہا ہے کہ وہ فوری طور پر سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی خالی اسامیوں کی گنتی کریں اور ان پر تقرری کے لیے جلد ہی TRE-4 امتحان منعقد کرنے کے لیے کارروائی کریں۔ ریاستی حکومت نے پہلے ہی واضح کر دیا ہے کہ تقرریوں میں خواتین کے لیے 35 فیصد ریزرویشن کا فائدہ صرف بہار کی خواتین کو ہی دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ رواں سال جنوری کے مہینے میں نائب وزیرِ اعلا سمراٹ چودھری نے اپنے ایک ایکس پوسٹ میں بتایا تھا کہ چوتھے مرحلے میں 80 ہزار سے زیادہ اساتذہ کی تقرری ہونے جارہی ہے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ تقرری انتخابات سے قبل کی جائے گی۔ حکومتِ بہار کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے جاری کردہ سابقہ اعداد وشمار کے مطابق ریاست میں دو لاکھ سے زیادہ اساتذہ کے عہدے خالی ہیں جن میں سے تقریباً 36 ہزار سیکنڈری اور 33 ہزار ہائر سیکنڈری سطح کے اساتذہ ہیں۔ نئی تشخیص میں یہ ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ بہار حکومت کے محکمۂ تعلیم نے حال ہی میں نوٹیفکیشن جاری کیا تھا اور 7279 عہدوں کے لیے درخواستیں طلب کی تھیں۔ ان میں سے 5534 پہلی سے پانچویں جماعت تک کے اساتذہ کے لیے ہیں اور 1745 چھٹی سے آٹھویں تک کے اساتذہ کے لیے ہیں۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سلیکشن ٹیسٹ کا انعقاد کیا جائے گا۔ جلد ہی محکمۂ تعلیم اساتذہ کے مزید 80 ہزار خالی عہدوں کے لیے درخواستیں طلب کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وزیرِ اعلا کی ہدایات کے بعد اس میں مزید تیزی آنے کا امکان ہے۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ TRE-3 میں 20 ہزار سے زائد اسامیاں خالی رہ گئی ہیں، ان خالی اسامیوں کو بھی TRE-4 میں شامل کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ BPSC TRE-4 کے لیے اہلیت کا معیار TRE 1، 2 اور 3 جیسا ہی ہوگا۔ اس کے تحت پرائمری ٹیچر بننے کے لیے بارہویں پاس کرنے کے ساتھ DLD ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح مڈل اسکول کے لیے گریجویٹ ہونے کے ساتھ امیدوار کے پاس DLD ہونا چاہیے۔ سیکنڈری ٹیچر کے لیے DLD/B.Ed کے ساتھ گریجویشن ضروری ہے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

اردو اکادمی دہلی، وقف بورڈ اور اقلیتی کمیشن کی تحلیل شدہ کمیٹیوں کی جلد از جلد تشکیلِ نو کا مطالبہ

نئی دہلی (18 جولائی)۔ اردو اکادمی دہلی، دہلی وقف بورڈ اور دہلی اقلیتی کمیشن جیسے اہم ادارے گذشتہ کئی ماہ سے بغیر چیئرمین کے کام کر رہے ہیں کیوں کہ ان اداروں کی کمیٹیاں تحلیل ہیں۔ اس انتظامی جمود کے سبب نہ صرف اقلیتوں سے متعلق اہم معاملات تعطل کا شکار ہیں بلکہ اردو زبان وثقافت سے جڑی سرگرمیاں بھی بُری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ اس سنگین صورتِ حال پر دہلی کانگریس کے سینئر ترجمان ڈاکٹر نریش کمار نے وزیرِ اعلا ریکھا گپتا کو ایک میمورنڈم ارسال کیا ہے۔ میمورنڈم کی ایک نقل دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر وی. کے. سکسینہ کو بھی ارسال کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نریش کمار نے میمورنڈم میں کہا کہ دہلی اردو اکادمی، دہلی وقف بورڈ اور دہلی اقلیتی کمیشن محض رسمی ادارے نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، اُردو زبان وادب کی ترویج اور وقف جائدادوں کی نگرانی ہے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ ان اداروں کو مہینوں سے بغیر سربراہ کے چلایا جارہا ہے جس سے پورا نظام مفلوج ہو چکا ہے۔ انھوں نے سخت الفاظ میں دہلی کی موجودہ بی جے پی حکومت کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ نہ حکومت کو اردو زبان سے دل چسپی ہے نہ اقلیتوں کے مسائل سے۔ یہ سراسر انتظامی لاپروائی اور اقلیتوں کے ساتھ بے حسی کی انتہا ہے۔ بی جے پی کو چاہیے کہ وہ امتیازی رویہ ترک کرے اور سب کے لیے یکساں پالیسی اپنائے۔ ڈاکٹر نریش کمار نے میمورنڈم میں مطالبہ کیا ہے کہ مذکورہ اداروں کی کمیٹیاں فوری طور پر دوبارہ تشکیل دی جائیں اور ان کا چیئرمین مقرر کیا جائے تاکہ ادارے اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر بروقت اقدام نہ کیا گیا تو کانگریس پارٹی عوام کو ساتھ لے کر سڑکوں پر اترنے سے گریز نہیں کرے گی۔ (انقلاب۔ دہلی)

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ

نئی دہلی (16 جون، پریس ریلیز)۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت محمد خالد صدیقی (سابق ڈائرکٹر جنرل سی سی آر یو ایم) نے کی۔ اس میٹنگ میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر شمس اقبال کے علاوہ پروفیسر اشہر قدیر (شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ)، ڈاکٹر محمد ذوالکفل (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن)، پروفیسر آسیہ سلطانہ (صدر شعبہ علاج بالتدبیر، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ)، حکیم وسیم احمد اعظمی (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ)، ڈاکٹر وسیم احمد (شعبۂ کلیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور)، ڈاکٹر امان اللہ (ریسرچ آفیسر، سائنٹسٹ، سی سی آر یو ایم، منسٹری آف آیوش نئی دہلی)، ڈاکٹر اشفاق احمد (حیدرآباد)، حکیم نازش احتشام اعظمی (میڈیکل آفیسر انچارج، نئی دہلی)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک، قومی اردو کونسل، نئی دہلی)، محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) اور ڈاکٹر عبدالباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یونانی میڈیسن پینل بہت اہم پینل ہے۔ اس پینل کے تحت بہت سی اہم طبی کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ اس پینل کی کتابیں حوالے کے طور پر طلبہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ آپ حضرات کے تعاون سے اس پر زیادہ سے زیادہ کام ہو اور گذشتہ برسوں میں اس پینل سے متعدد اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی ماہرین سے دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق کتابیں لکھوائی جائیں جو اطبا اور طبِ یونانی کے طلبہ کے لیے مفید و معاون ہوں۔ اس پینل کے صدر ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے صدارتی کلمات میں کونسل کے کاموں کی ستائش کی اور کہا کہ طبِ یونانی کے کلاسیکی مواد کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ مواد تیار کرتے وقت طلبہ کی ضرورتوں اور ان کی ذہنی ساخت کا بھی خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ میٹنگ کے دوران اس پینل کے تحت مختلف ایجنڈوں پر غور و خوض کیا گیا اور کئی اہم فیصلے لیے گئے۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) کے اظہارِ تشکر پر میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی وظیفے

نئی دہلی (25 جون، پریس ریلیز)۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئے تعلیمی سال کے لیے قرض وظیفے جاری کرنے کے واسطے درخواستیں طلب کرتی ہے۔ صرف وہی مسلم طلبہ وطالبات درخواست بھیجنے کے مجاز ہوں گے جنھوں نے دسواں درجہ (میٹرک) بارہواں (انٹر) یا اس کے مساوی امتحان یا گریجویشن کم از کم 80 فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو اور جن طالبِ علموں کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں درخواست دینے والے طلبہ میں سب سے زیادہ پائے جائیں گے۔ سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن کے علاوہ کامرس، اکنامکس اور سوشل سائنسز کے طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔

وظیفے کی رقوم کا فیصلہ کورسز کے اعتبار سے سلیکشن کمیٹی کرے گی۔ جو طلبہ وطالبات وظیفے کے حقدار ٹھہریں گے اُن کو ایک بانڈ بھر کر دینا ہوگا کہ تعلیم مکمل کر لینے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد قرض وظیفہ کی رقم واپس کرنا ہوگی۔ وظیفہ پانے والے طلبہ کی پیش رفت کا ہر سال احتساب ہوگا اور اگر رفتار اطمینان بخش پائی گئی تو وظیفے کی تجدید کی جائے گی۔ وظیفے کا فیصلہ کرتے وقت صلاحیت اور مالی حالت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

غیر ملکی طلبہ کو یہ وظیفہ نہیں دیا جاتا ہے۔ وظیفے کی اسکیم سوسائٹی کے سابق صدر مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر اس لیے جاری کی گئی تھی کہ ہندستانی مسلمان جو تعلیم میں پیچھے ہیں، انھیں تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے اور ان میں مقابلے کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ تعلیمی پس ماندگی سے نکل کر ملک کی ترقی میں زیادہ موثر کردار ادا کرسکیں۔

جو مسلم طلبہ یہ وظائف پانے کے خواہش مند ہیں اور جن کا ارادہ ہے کہ وہ تعلیم کا سلسلہ عصری تعلیم کے کسی تسلیم شدہ ادارے سے کم از کم 2026-27 کے تعلیمی سال تک جاری رکھیں گے۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے درخواست فارم ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں:

www.hamdardeducationsociety.org.in

یا سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی-110080 کے نام خط بھیج کر درخواست فارم منگوا سکتے ہیں۔ بھرے ہوئے فارم 30 ستمبر 2025 تک وصول کیے جائیں گے۔

درخواست دہندگان پر لازم ہوگا کہ وہ درخواست فارم کے ساتھ مارک شیٹ، بونافائڈ اسٹوڈنٹ سرٹیفکیٹ، ماہانہ انکم سرٹیفکیٹ کی اٹسٹڈ فوٹو کاپی ضرور منسلک کریں۔

اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو فوری پُر کیا جائے

کھمم، تلنگانہ (10 جولائی)۔ کھمم سٹی کانگریس کے صدر و رکن پی سی سی محمد جاوید نے ریاستی وزیر اقلیتی بہبود اولوری لکشمن سے سکریٹریٹ میں ملاقات کرتے ہوئے اقلیتوں کے مسائل اور اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے مطالبے کو لے کر یادداشت پیش کی۔ اس موقعے پر محمد جاوید نے ریاستی وزیر اقلیتی بہبود اولوری لکشمن سے کہا کہ پچھلے 16 برسوں سے 672 اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو پُر نہیں کیا گیا۔ محمد جاوید نے ریاستی وزیر اقلیتی بہبود سے مطالبہ کیا کہ اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو فوری پُر کیا جائے ورنہ اردو میڈیم سے وابستہ طلبہ کا مستقبل غیر یقینی ہو جائے گا۔ اس موقعے پر محمد جاوید کے ہمراہ عبدالحفیظ بشیر، سمیرہ سلطانہ، انور فاطمہ، اسما تبسم اور فہمیدہ بیگم شامل تھے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

وزیرِ اعلا بہار سے اردو اکادمی اور اُردو مشاورتی کمیٹی کی تشکیلِ نو کا مطالبہ

حاجی پور (18 جولائی)۔ سماجی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی میدان سے وابستہ شخصیات ڈاکٹر عظیم انصاری، ڈاکٹر جمال انصاری، پروفیسر محمد واعظ الحق اور محمد افروز عالم نے الگ الگ پریس بیان جاری کر کے وزیرِ اعلا جناب نتیش کمار جی سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو کے فروغ و بقا میں اہم کردار ادا کرنے والے راجدھانی پٹنہ کے دو اداروں: اُردو اکادمی اور اُردو مشاورتی کمیٹی میں برسوں سے سکریٹری اور چیئرمین کے عہدے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ سکریٹری اور چیئرمین کے نہیں رہنے کی وجہ سے اردو کے کام نہیں ہو رہے ہیں۔ اسکالروں کے وظیفے بند، ادیبوں اور صحافت سے وابستہ لوگوں کی عزت افزائی وغیرہ جیسے معاملے تاخّر کا شکار ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ پانچ برسوں سے اردو اکادمی میں سکریٹری اور اردو مشاورتی کمیٹی میں چیئرمین کی بحالی نہیں کی جا رہی ہے۔ حکومتِ بہار کے وزیرِ اعلا جناب نتیش کمار اردو زبان کے فروغ اور بقا کے لیے کافی سنجیدہ ہیں تو پھر ان دونوں اداروں میں سکریٹری و چیئرمین کی بحالی میں تاخیر کیوں؟ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین کا جس طرح انتخاب ہوا ہے، اسی طرح اردو اکادمی اور مشاورتی کمیٹی میں بھی پہل ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر عظیم انصاری، ڈاکٹر جمال انصاری، محمد واعظ الحق اور محمد افروز عالم نے مطالبہ کیا کہ ان اداروں میں سکریٹری و چیئرمین کی بحالی میں بہار کے وزیرِ اعلا اب مزید دیر نہ کریں نیز جب تقرری ہو تو اس میں ادیبوں اور صحافتی میدان سے وابستہ شخصیات کو بھی شامل کریں اور ہر ضلع سے کمیٹی میں رکن منتخب کریں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک دو ضلعے کے لوگوں کو ہی فوقیت دی جاتی رہی ہے جب کہ ویشالی ضلع راجدھانی پٹنہ سے بالکل قریب ہے، وہاں کے سیاسی رہنماؤں، ادیبوں اور صحافیوں کو حاشیے پر رکھ دیا جا رہا ہے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

اردو کی بقا کے لیے کچھ نئے اقدام کرنے ہوں گے

ٹیم 'انقلاب' کے ساتھ ھمدرد لیباریٹریز کے چیئرمین عبدالمجید ثانی کی خصوصی گفتگو

نئی دہلی (یکم جولائی)۔ ہمدرد لیباریٹریز کے چیئرمین عبدالمجید ثانی نے کہا کہ اس وقت اردو والوں کو بڑے پیمانے پر اردو کے فروغ اور اس کی بقا کے لیے کچھ نئے اقدام کرنے ہوں گے اور اردو کو فقط اردو حلقوں تک محدود نہ سمجھ کر اس کی رسائی کو آسان بنانے اور غیر اردو داں حلقوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ وہ آج یہاں 'انقلاب' کی ایک خصوصی ٹیم سے گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کہ اردو کا استعمال خود اہلِ اردو کے یہاں کم ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ دور ہمہ زبانی کا ہے اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل کرنا ضروری ہے لیکن یہ دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے کہ جن گھرانوں میں کبھی اردو ہی اوڑھنا بچھونا تھی وہاں آج اردو کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو باقی رکھنے میں بڑی حد تک اردو اخبارات اور ان کے قارئین کا بڑا کردار ہے۔ انھوں نے طبِ یونانی اور دینی مدارس کو بھی اردو کی بقا کا ضامن قرار دیتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اردو والوں کو کچھ ایسے نئے اقدام کرنے ہوں گے جن سے نئی نسل کو اردو کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے کی تحریک پیدا ہو۔

واضح رہے کہ شمالی ہندستان میں مقبول ترین روزنامہ 'انقلاب' کو گذشتہ دنوں 14 سال پورے ہو گئے ہیں۔ اسی ضمن میں 'انقلاب' کی ایک خصوصی ٹیم حکیم عبدالمجید ثانی کو 'انقلاب' کے ساتھ مسلسل اشتراک جاری رکھنے پر شکریہ ادا کرنے گئی تھی۔ اس موقعے پر عبدالمجید ثانی نے بھی 'انقلاب' کے اڈیٹر اور پبلشر ودود ساجد اور آل انڈیا مارکیٹنگ ہیڈ اور جی ایم عارف محمد خاں کو کامیابی کے 14 سال پورے ہونے پر مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ 'انقلاب' اور ہمدرد کا رشتہ اٹوٹ ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ واضح رہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے 'انقلاب' اور ہمدرد 'ہیلتھ کوئز' کا وہ مقبولِ عام پروگرام کرتے آ رہے ہیں جس کے نتیجے میں اب تک پچاس سے زائد خوش نصیب افراد عمرے کے مقدس سفر پر جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئز کے دیگر فاتحین کو ہر سال مختلف قیمتی انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے 'انقلاب' اور ہمدرد مختلف میدانوں کی بڑی شخصیات کو انتہائی باوقار ایوارڈ سے بھی نواز رہے ہیں۔ اس سال بھی ہمدرد کے تعاون سے ان دونوں پروگراموں کے انعقاد کی تیاری جاری ہے۔ عبدالمجید ثانی نے اڈیٹر 'انقلاب' سے دیگر بہت سے اہم امور پر بھی کھل کر بات کی۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے ہمدرد کے تعاون کی یقین دہانی بھی کرائی اور کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔ اس موقعے پر ہمدرد لیباریٹریز کے سیلز اینڈ میڈیکو مارکیٹنگ کے ہیڈ محمد زبیر اور ہمدرد لیباریٹریز کے برانڈ منیجر شمیم احمد بھی موجود تھے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں بچوں کو داخلہ دلوانے کی اپیل

ظہیر آباد (8 جولائی)۔ محمد تاج الدین تاج (صدر آل انڈیا مائنارٹی ویلفیئر ایسوسی ایشن، ضلع سنگاریڈی) نے اپنے صحافتی بیان میں والدین، سرپرست حضرات اور تمام باشعور شہریوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو میڈیم سرکاری مدارس میں اپنے بچوں کے داخلے کو ترجیح دیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا نہ صرف تعلیمی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے بلکہ بچوں کی ذہنی نشوونما، شخصیت سازی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی فروغ دیتا ہے۔ مادری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے بچے اپنے خیالات اور جذبات کا بہتر اظہار کر سکتے ہیں اور معاشرتی وثقافتی ورثے کو بھی سنبھال کر آگے لے جا سکتے ہیں۔ اردو زبان ہماری تہذیب، تاریخ، ادب اور ثقافت کی نمائندہ ہے۔ اس زبان کی بقا اور فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو میڈیم مدارس میں تعلیم دلائیں تا کہ آنے والی نسلیں اس قیمتی ورثے کو نہ صرف سمجھ سکیں بلکہ اس پر فخر بھی کر سکیں۔ اردو میڈیم سرکاری مدارس میں بچوں کو مفت کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور معیاری دوپہر کا کھانا بھی دیا جاتا ہے۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

عبدالمجید خاں مجید

پٹنہ۔ اردو کے معروف شاعر عبدالمجید خاں مجید طویل علالت کے بعد 3 جولائی 2025 کو موتیہاری میں انتقال کر گئے۔ اُن کا جسدِ خاکی بتیا شہر میں اُن کی رہائش گاہ پر لایا گیا اور 4 جولائی کو بعد نمازِ جمعہ تدفین عمل میں آئی۔

عبدالمجید خاں بتیا شہر میں 12 دسمبر 1949 کو پیدا ہوئے تھے۔ 1967 میں انھوں نے اردو ہائی اسکول، بتیا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ منشی سنگھ کالج، موتیہاری سے 1971 میں گریجویشن کیا۔ 1975 میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم ہوئے اور مغربی چمپارن اور گوپال گنج ضلع کے مختلف برانچوں میں منیجر کی حیثیت سے ذمے داریاں ادا کرتے ہوئے 2009 میں سبک دوش ہوئے۔ بتیا کے شاعروں اور ادیبوں کے حلقے میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی زندگی کی چالیس بہاریں گزارنے کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کی اور مشہور شاعر ایم. وفا سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ پہلا شعری مجموعہ 'اک آگ سی سینے میں' 2004 میں شائع ہوا۔ دوسرا اور آخری مجموعہ 'دست ہنر' نے اُن کی شاعری کو مزید مقبولیت عطا کی۔ وہ مشاعروں میں ترنّم سے اپنا کلام پیش کرتے تھے اور مختلف ادبی نشستیں منعقد کرتے رہتے تھے۔ آمنہ اردو ہائی اسکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے وہ صدر تھے۔ بعد میں سجاد پبلک اردو لائبریری کے بھی وہ صدر ہوئے اور انھی کے دور میں لائبریری کی نئی عمارت تیار ہوئی۔ سماجی اور ثقافتی تنظیموں سے اُن کا بڑا گہرا رشتہ تھا اور شہر کی مختلف ادبی تنظیموں سے وہ بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

اردو کے شعرا و اُدبا نے بنارس کی اہمیت پر خصوصی توجہ دی ہے: آفتاب احمد آفاقی

میں اردو اور ھندی کی مصنوعی رقابت کا سخت مخالف ھوں: جانکی پرشاد شرما

شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی میں ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے اشتراک سے 'اردو شعر وادب میں بنارس' کے موضوع پر سمپوزیم کا انعقاد

وارانسی (19 جولائی)۔ آج شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی میں ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے اشتراک سے دوروزہ ادبی وشعری پروگرام کے تحت قومی سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت شعبے کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کی۔ نظامت کے فرائض شعبے کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے انجام دیے۔ افتتاحی پروگرام میں کلیدی خطبہ جانکی پرشاد شرما نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بنارس کو کئی حوالوں سے سمجھا جا سکتا ہے بالخصوص عالم کاری کے حوالوں سے اسے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شہر میں سے گم ہوتے ہوئے شہر کا المیہ یہ ایک ملک گیر فینومینا ہے۔ قصبوں میں سے قصبہ گھٹ رہا ہے، شہر میں سے شہر گھٹ رہا ہے۔ اسی طرح بنارس شہر کا تذکرہ جو ادب میں ہے وہ بھی گھٹ رہا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو ہندی کی مصنوعی رقابت کا میں سخت مخالف ہوں۔ میں اسے نہیں مانتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس بنارس کی تلاش ہے، جس کا تذکرہ ادب میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ طغری مہدی، علی حزیں سے قبل بنارس آئے تھے۔ انھوں نے علی حزیں کے بنارس سے متعلق فارسی کلام کو بھی حوالوں میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں بنارس کی پوری تاریخ پر تفصیل سے بحث کی۔ محسن کاکوری کے نعتیہ قصیدے کا بھی انھوں نے ذکر کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ:

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

انھوں نے زور دے کر کہا کہ الطاف حسین حالی نے بھی اپنے کلام میں بنارس کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے:

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہے یاد تم کو
اترا ترے کنارے؛ جب کارواں ہمارا

سچائی یہ ہے کہ یہ شہر آدھا ہے اور آدھا نہیں ہے، اسی لیے اس پورے شہر بنارس کو تلاشنے کی ضرورت ہے۔

ممتاز قلم کار شمیم طارق نے اردو ادب میں کاشی کے تذکرے پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی۔ انھوں نے ولی دکنی، ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : گردِ راہِ یار (شاہد جمیل کے حوالے سے)
مصنف : ملیح بدؔر
ضخامت : 128 صفحات
قیمت : 205 روپے
ملنے کا پتا : تاج بک ڈپو، نزد اقرأ مسجد، مین روڈ، رانچی-834001
تبصرہ نگار : ڈاکٹر اشرف علی

E-mail: ashrafalimehdvi@gmail.com

آج میرے مطالعے کے ڈیسک پر جو کتاب جلوہ فگن ہے اس کا نام ہے ’گردِ راہِ یار‘، جس کے مصنف ہیں ملیح بدر۔ ملیح بدر دراصل ملیح الزماں خان کا قلمی نام ہے جو آج کل ایم زیڈ خان کے نام سے دنیائے ادب میں اپنی ایک خاص شناخت قائم کر چکے ہیں۔

ایم زیڈ خان کا آبائی وطن سہسرام، بہار ہے مگر اب وہ سبکدوشی کے بعد مستقل طور پر نگار ولا، امن گرین سٹی، پنڈاگ، رانچی میں سکونت پذیر ہیں، انھیں رانچی کی ادبی شخصیات میں ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ ان کی شخصیت نہ صرف ایک قادر الکلام ادیب کی حیثیت سے معروف ہے بلکہ وہ سماجی و رفاہی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کا عملی دائرہ مختلف انجمنوں اور تحریکات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ جھارکھنڈ کے مرکزی نمائندہ اور انجمن جمہوریت پسند مصنّفین رانچی، جھارکھنڈ کے صدر ہیں، ساتھ ہی آل انڈیا پوسٹل اینڈ آر ایم ایس پنشنرز ایسوسی ایشن جھارکھنڈ کے نیشنل جوائنٹ سکریٹری کے منصب پر بھی فائز ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا پوسٹل اینڈ آر ایس پنشنرز ایسوسی ایشن جھارکھنڈ کے اسٹیٹ سکریٹری اور سنٹرل گورنمنٹ پنشنرز ایسوسی ایشن رانچی، جھارکھنڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی اپنی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یوں ملیح بدر کی ذات ادب، سماج، ثقافت اور خدمت کے حسین امتزاج کا ایک روشن استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریریں جہاں فکری بالیدگی کی آئینہ دار ہیں تو وہیں ان کی عملی زندگی انسان دوستی، اخوت اور خدمتِ خلق کا درخشاں نمونہ ہے۔ ’گردِ راہِ یار‘ بھی ان کے اسی متنوع فکری اور ادبی سفر کی ایک خوب صورت کڑی ہے جس کا مطالعہ یقیناً قاری کے دل و دماغ پر دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔

اس کتاب کا عنوان غالبؔ کے اس لازوال شعر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں دل کی خلش، یاد کی کسک اور زندگی کی تلخی کو کس قدر خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے:

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

یوں تو یہ کتاب دراصل ایک تذکرۂ ایام ہے جس میں وہ سب حسین لمحے سانس لیتے نظر آتے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں کی دل آویز محفلوں میں گزارے۔ ان یادوں میں اٹھکھیلیوں کی شوخی، شرارتوں کی کھنک اور ہنسی کی گونج آج بھی زندہ ہے۔ یہاں محض خوش طبعی اور رفاقت کی کہانیاں ہی نہیں ملتیں بلکہ اس میں تعلیم کی راہوں میں کی گئی جانفشانی، علم کے لیے جدو جہد، کھیل تماشوں کی رنگینی اور مشقِ سخن کی مٹھاس بھی موجود ہے جو ہر صفحے پر ایک نیا منظر بکھیر دیتی ہے۔

یہ تصنیف اپنے اسلوب میں اس قدر دل نشین و افسانوی ہے کہ قاری کو گمان ہونے لگتا ہے گویا خودنوشت کی نرم و لطیف بُکلوں میں لپٹے خاکے پڑھ رہا ہو جن میں مرقع نگاری کا جمال بھی ہے اور انشائیہ کی موجِ ترنگ بھی۔

اردو کے خدائے سخن میر تقی میرؔ نے دلّی کے بارے میں کیا خوب کہا تھا:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اگر اس شعر کی معنوی جھلک کہیں آج بھی دیکھی جا سکتی ہے تو وہ ’گردِ راہِ یار‘ میں موجود سہسرام کی مرقع کشی ہے جسے مصنف نے بڑی محبت اور فنکارانہ چابک دستی سے صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔

چوں کہ ایم زیڈ خان خود سہسرام کے رہنے والے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے مشاہدے اور قلبی لگاؤ کے ساتھ جس طرح وہاں کی ادبی سیر کرائی ہے وہ لطف اور رنگ کہیں اور اس شدت سے شاید ہی میسر آ سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سہسرام کی گلیاں، کوچے، محفلیں، کتابیں اور دوستیاں سب گویا قلم کی سیاہی میں ڈوب کر ایک جیتی جاگتی تصویر بن گئی ہیں جو ہر قاری کو اپنی دلکشی کے حصار میں لے لیتی ہیں۔

یہ پوری کتاب دراصل شاہد جمیل کے گرد گردش کرتی ہے۔ گو اس میں سہسرام کی ادبی فضا، وہاں کے اخبارات و رسائل، ادبی تنظیمیں اور ادارے، محرم و نعل کی روایتی گہما گہمی اور متعدد شخصیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کا مرکزی نقطہ شاہد جمیل ہی ہیں، گویا وہ اس تذکرے کا محور و مرکز بنے ہوئے ہیں۔

مصنف نے شاہد جمیل سے اپنے ذاتی رشتوں اور دیرینہ تعلقات کو اس قدر خوبی اور محبت سے بیان کیا ہے کہ قاری کی طبیعت مسرور ہو جاتی ہے۔ کتاب کے اوراق پڑھتے ہوئے دل میں ایک لطیف سی سرشاری اترتی چلی جاتی ہے جیسے کوئی میٹھا نغمہ خاموشی سے سنائی دے رہا ہو جو دوستوں کی یاد، گزرے ہوئے لمحوں اور قلبی وابستگیوں کی مہک سے لبریز ہے۔

ان سب کے باوجود یہ کتاب صرف شوخی اور سرپرستی ہی کی داستان نہیں بلکہ اس میں ایسی لطیف حقیقتیں، پوشیدہ تاریخ کے اوراق، گمنام ادبی شخصیات اور ان کی محفلوں کی بازگشت بھی سموئی ہوئی ہے کہ قاری حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

اس کتاب میں ایک مقام خصوصیت کے ساتھ قابلِ دید ہے اور وہ ہے محرم میں اٹھائے جانے والی نعل کا ذکر۔ سہسرام کا محرم محض ثقافتی رسومات تک محدود نہیں بلکہ اپنی تاریخی و تہذیبی عظمت کے سبب ایک منفرد شان رکھتا ہے۔ یہاں محرم کے ایام میں نوجوان، بوڑھے اور بچے سبھی ایک خاص جوش و ولولے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ تعزیہ داری پورے اہتمام سے کی جاتی ہے اور دس دنوں تک گلیوں کوچوں میں ایک روحانی سی گہما گہمی چھائی رہتی ہے۔ خاص طور پر جب نعل اٹھائی جاتی ہے تو فضا میں عجب کیف و وجد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ روایت ہے کہ کوئی بڑے بزرگ عراق سے ایک گھوڑے کی نعل اپنے ہمراہ لائے تھے جسے آج بھی محرم میں نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ اس پر نیاز و فاتحہ دی جاتی ہے، عقیدت مند نعل کا بوسہ لیتے ہیں اور منتیں بھی مانگتے ہیں۔

نعل اٹھانے والا مخصوص درود کا ورد کرتا ہوا ایک وجدانی کیفیت میں دوڑنے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نعل کیفیت میں نہیں ہوتی ہے تو اس کا وزن بمشکل ایک کلو سے ڈیڑھ کلو ہوتا ہے مگر جب اس پر ورد شروع ہوتا ہے تو اس کا وزن تیس چالیس کلو تک جا پہنچتا ہے اور اسے اٹھانے والا خود اپنی مرضی کا مالک نہیں رہتا بلکہ نعل جس سمت کھینچتی ہے وہ اسی سمت دوڑتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ نعل بزرگان کی مزارات پر سجدہ کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ اپنی پہلی کیفیت میں واپس آ جاتی ہے۔ لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ گو اسلامی عقائد میں اس کی کوئی خاص حیثیت نہ ہو لیکن سہسرام کے محرم اور وہاں کے لوگوں کے دلوں میں اس نعل کی عقیدت سر چڑھ کر بولتی ہے اور ایک عجیب روحانی سماں باندھ دیتی ہے۔

اسی طرح یہ کتاب سہسرام کے تعلیمی اداروں کی ایسی تاریخ، اس کی گلیوں، کوچوں اور محلوں کا ایسا رنگین و دقیق نقشہ پیش کرتی ہے کہ پڑھتے پڑھتے قاری ان راستوں سے جانے اَنجانے میں خود گزرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ یوں ہر صفحہ سہسرام کی تہذیبی، ادبی اور سماجی فضا کا ایک نیا دریچہ کھول دیتا ہے جس سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل و دماغ کو معطر کرتے رہتے ہیں۔

بالآخر میں قارئین کو ملیح بدر کی اس دلکش تصنیف ’گردِ راہِ یار‘ کا مطالعہ کرنے کا مخلصانہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں کیوں کہ اس کتاب میں صرف دوستوں کی شوخیاں، محفلوں کی شرارتیں اور ادبی چاشنیاں ہی نہیں بلکہ سہسرام کی وہ پوشیدہ تاریخ، گمنام ادبی شخصیات، ان کی محفلیں اور تعلیمی اداروں کے ایسے لطیف حقائق بھی محفوظ ہیں جو ہمیں اس شہر کے ثقافتی و فکری مزاج سے روشناس کراتے ہیں۔

مصنف نے شاہد جمیل سے اپنے تعلقات کو جس محبت اور فنکارانہ انداز سے بیان کیا ہے وہ دل کو چھو جاتا ہے اور اس طرح یہ کتاب محض یادوں کا مرقع ہی نہیں بلکہ سہسرام کی گلیوں، کوچوں اور ادبی فضاؤں کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے جسے ادب کی اصطلاح میں محاکات کہتے ہیں۔

◆◆◆

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟
ڈاکٹر شمس بدایونی
قیمت: 300 روپے

کچھ اُداس نظمیں
ہربنس مکھیا
قیمت: 300 روپے

غروبِ شہر کا وقت
اُسامہ صدیق
قیمت: 900 روپے

اردو کی پہلی مزاح نگار خاتون

شفیقہ فرحت

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

چوتھی تصنیف طنزیہ ومزاحیہ کہانیاں 'چوں چوں بیگم' بچوں کے لیے 1988 میں شائع ہوئی۔ پانچویں کتاب 'ٹیڑھا قلم' طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ 2003 میں، چھٹا 'نیم چڑھا' یہ بھی طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا، 2004 میں اور ساتویں تصنیف 'چہرے جانے انجانے' شخصیات پر شگفتہ نثر میں تحریر خاکے 2006 میں منظرِ عام پر آئے۔ اِن کے علاوہ کم از کم نصف درجن کتابیں شائع نہیں ہوسکیں۔

شفیقہ فرحت کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سات ہے جو 1981 سے 2006 کے درمیان شائع ہوتی رہیں۔ اِن کی مسلسل اشاعت سے ہم اُن کے قلم کی روانی، ذہنی زرخیزی اور مطالعے کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اِس قادرالکلام ادیبہ نے جس طرح طنزیہ ومزاحیہ ادب کی سنگلاخ زمین میں گل کاریاں کیں، ساتھ ہی افسانوی ادب کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کیا، اُس کا ملکی سطح پر اعتراف نہیں ہوا۔ بھوپال کے اہلِ قلم کی تین کتابیں 'بچوں کی شفیقہ فرحت'، انیس سلطانہ، 'شفیقہ فرحت'، رشیدہ بیگم اور 'شفیقہ فرحت: فن اور شخصیت' نجیب رامش کے علاوہ شفیقہ فرحت پر ایم اے کا تحقیقی مقالہ مہر النسا، عارف اندور نے لکھا ہے جو شائع نہیں ہوا۔ اقبال مسعود اور شگفتہ فرحت (کراچی) کے مضامین ضرور چھپ چکے ہیں۔

شفیقہ فرحت کی کہانیوں کو اگر سماجی زندگی کی بولتی تصویریں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے کردار، اُن کی جانی پہچانی دنیا، اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، اُن کی عادتیں اور مجبوریاں اُن کی اُلجھنیں اور پریشانیاں، سب مل کر ایک ایسا تانا بانا بُنتے ہیں، جو حقیقت میں یقین کی ایک کائنات کھڑی کر دیتے ہیں۔ شفیقہ فرحت اپنی کہانیوں کے لیے تفصیلات کی ایک ایسی فضا تیار کرتی ہیں جو ایک طرف سماجی واقعیت کے تاثر کو تقویت دیتی ہے تو دوسری جانب وہ کہانی کی علامتی بنیاد میں ایک بامعنی اضافہ کر دیتی ہے۔

اُن کے مضامین کا نثری پیرہن بھی تکلّفات سے عاری اور آرائشِ بیان کے چونچلوں سے دور نظر آتا ہے۔ اِسی طرح اُن کے کردار خدوخال سے نہیں، اپنے ماحول، طور طریقے، اپنے لباس، عمل، ردِّ عمل سے پہچانے جاتے ہیں، جن کی شناخت کے لیے شارح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی حال اُن کی کہانیوں کے مکالمے کا بھی ہے کہ بڑے نپے تلے ہیں، جنھیں وہ بحث ومباحثے، دلیل ومنطق، تبصرے وتنقید کے لیے استعمال نہیں کرتیں بلکہ اُن کے ذریعے کرداروں کی خوبیوں و خامیوں کی جھلک پیش کر دیتی ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی شفیقہ فرحت کی کہانیاں اِس قابل ہیں کہ اُن پر سیر حاصل گفتگو ہو تاکہ مشاہدے اور فکر کے اظہار کے جو پہلو اُن میں ملتے ہیں اُن کی پہچان ہوسکے اور ایک نئی شفیقہ فرحت کا تعارف ہوسکے۔

ڈاکٹر مرضیہ عارف
مکان نمبر 4، اسٹریٹ نمبر 1، ریت گھاٹ روڈ، بھوپال–462001
Mob. 9826062115

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اُردو فکشن کے قُطب نُما: پریم چند

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

گاندھی جی کی ایما پر ہی انھوں نے 'ہنس' جاری کیا۔ گاندھی جی سے مل کر جب گھر لوٹے تو پریم چند گاندھی جی کے مرید ہو چکے تھے۔ ان کی شریکِ حیات شیورانی دیوی نے اپنی کتاب 'پریم چند: گھر میں' میں اس کا خلاصہ کیا ہے کہ جب پریم چند احمد آباد سے لوٹے تو انھوں نے کہا:

> ''جتنا میں مہاتما کو سمجھتا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ مجھے ملے۔ مہاتما جی سے ملنے کے بعد کوئی ایسا نہیں ہوگا جو بغیر ان کا ہوئے لوٹ آئے۔ یا تو وہ سب کے ہیں یا وہ اپنی جانب سب کو کھینچ لیتے ہیں۔ میں مہاتما گاندھی کو دنیا میں سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا مقصد ہے کہ مزدور اور کسان خوشحال ہو۔ وہ ان لوگوں کو آگے بڑھانے کے لیے تحریک چلا رہے ہیں۔ میں لکھ کر ان کو حوصلہ دے رہا ہوں۔''

اور پریم چند اپنے اس قول پر تا عمر قائم رہے کہ 1921 کے بعد کے افسانوں اور ناولوں میں پریم چند فکری اعتبار سے بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فلسفۂ گاندھی کے مبلغ اور تحریکِ آزادی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد سجاد ظہیر کی قیادت میں 1936 میں ملک میں ڈالی جاتی ہے تو اس کی صدارت کے لیے حامی بھرتے ہیں اور لکھنؤ اجلاس میں بہ نفسِ نفیس شرکت کرکے ہندستان کے تمام ادیبوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب ہمیں 'حسن کا معیار بدلنا ہوگا' اور خود اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تخلیق کا قبلہ بدل دیا ہے۔ آخری دور کی کہانیوں 'آخری تحفہ'، 'کفن'، 'دودھ کی قیمت'، 'معصوم بچہ' اور 'قاتل' کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ گاندھی جی کے پرستار بن چکے ہیں۔ 'زیور کا ڈبّہ' لکھ کر یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف متحد ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ناولوں میں بھی گاندھی ازم کی جھلک دکھائی دیتی ہے بالخصوص 'میدانِ عمل' میں ایک نئے پریم چند دکھائی دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ پریم چند ہمیں صرف 'پوس کی رات' کی لہو کو منجمد کرنے والی ٹھنڈک اور 'ہلکو' کی بے بسی، 'کفن' کے مادھو، گھیسو اور دھنیا کی اذیت ناک زندگی سے ہی آشنا نہیں کراتے بلکہ جھوری کے دو بیلوں ہیرا اور موتی سے بھی ملاقات کراتے ہیں اور انسانی معاشرے میں حیوانی کرداروں کے وجود کی لازمیت کا احساس بھی کراتے ہیں۔ مجموعی طور پر پریم چند کا تخلیقی سفر دراصل انسان کے ہر طرح کے استحصال، محرومی، کشمکش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس لیے پریم چند کے عہد کے ہندستان کی سچائیوں سے روبرو ہونے کے لیے ہمیں پریم چند کے کرداروں سے رشتہ رکھنا ہوگا اور ہمیں پریم چند کو یاد رکھنا ہوگا کہ پریم چند کے افکار ونظریات کی معنویت اب بھی برقرار ہے کہ آزاد ہندستان میں بھی کسان خودکشی کر رہے ہیں، مزدوروں کے قافلے پر کیڑا کش دواؤں کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے اور آگرہ کی ایک دلت عورت کی لاش کو سماج کے اعلا طبقے کے شمسان میں جلانے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔

پروفیسر مشتاق احمد
پرنسپل، سی. ایم. کالج، دربھنگہ
E-mail: rm.meezan@gmail.com
Mob. No. 9431414586

اردو کے شعرا واُدبا نے بنارس کی اہمیت پر خصوصی توجہ دی ہے

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

نذیر بنارسی اور غالبؔ وغیرہ کے کلام کو حوالے کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے 'چراغِ دیر' میں بنارس کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ہدایت اللہ ہدایت، فراق، اختر شیرانی، میراجی، شیر علی افسوس وغیرہ کے یہاں بھی بنارس کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بنارسی اصطلاحات جیسے بنارسی گھاٹ، بنارسی ساڑی، بنارسی پان اور بنارسی چاٹ وغیرہ کا تذکرہ اردو ہندی کلام میں ملتا ہے، یہ ایک اضافہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج اس کا نام وارانسی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گنگا کے کنارے ورونا ندی اور اسی گھاٹ کے درمیان بسا ہوا یہ شہر ہے، اسی لیے اس کا نام وارانسی رکھا گیا ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے ہندی ایڈیٹر ڈاکٹر انوپم تیواری نے اس موقعے پر کہا کہ 'اردو شعر وادب میں بنارس' یہ بہت ہی اہم موضوع ہے۔ کاشی کا ادب میں بہت تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں ادب کی پوری تاریخ رہی ہے۔ تلسی، کبیر، کالی داس، امیر خسرو، ولی دکنی، غالب اور کیدارناتھ وغیرہ کا اس ضمن میں خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر تعارفی گفتگو کرتے ہوئے چندر بھان خیال نے کہا کہ اس موضوع پر پروگرام کرنے کی دلی خواہش تھی۔ ہم پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور ڈاکٹر مشرف علی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری مدد کی۔ انھوں نے کہا کہ بنارس گنگا جمنی تہذیب کا چہرہ ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

میں وہ کاشی کا مسلماں ہوں کہ جس کو کہ نذیر
گھیرے میں لیے رہتے ہیں مندر کئی ایک

انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو ادب میں بنارس کا تذکرہ بہت سے اردو ہندی شاعروں کے کلام میں ملتا ہے۔ چناں چہ غالب، محسن کاکوری، جوش ملیح آبادی، نذیر بنارسی اور حفیظ بنارسی وغیرہ کا خاص طور سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔

اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ سرزمینِ بنارس کا ذکر اردو شعر وادب میں بکثرت ملتا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شعرا وادبا نے بنارس کی عظمت کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر غالب اور غالب سے لے کر محسن کاکوروی واقبال، ان کے بعد نذیر بنارسی، حفیظ بنارسی اور پریم چند سے تاحال ایک طویل سلسلہ ہے جنھوں نے بنارس کی مشترکہ اقدار، یہاں کے مذہبی مقامات، مندروں اور گھنٹوں کی صداؤں وروحانی فضاؤں کو اپنے شعر وادب کا حصّہ بنایا ہے۔ اسی قدیم روایت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے مزید استحکام بخشنے کے مقصد سے اس سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ شہر غائب ہو رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تشخص غائب ہو رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں بنارس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ رینو بہل نے 'نجات دہندہ' ناول بنارس کے حوالے سے لکھا ہے۔ بنارس کی قدیم روایات کو ہم منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔ تلاشِ کبیر کتاب ہم لائیں گے تاکہ بنارس کے بارے میں لوگ سمجھ سکیں۔ اظہارِ تشکر کی رسم ڈاکٹر احسان حسن نے ادا کی۔

(رپورٹ: ڈاکٹر افضل مصباحی)

اردو فکشن کے قطب نما: پریم چند

پریم چند کی یومِ پیدائش کے موقعے پر

مشتاق احمد

منشی پریم چند (ولادت:31 جولائی 1880، وفات: 8 اکتوبر 1936) ہندستانی ادب کے ایسے فنکار ہیں جو کبھی لسانی تعصب کے شکار نہیں رہے۔ انھوں نے جب اپنے قلم کو تخلیقی جنبش سے آراستہ کیا تو ان کا وسیلۂ اظہار اردو رہا اور جب ان کے افکار ونظریات کی دنیا کائناتی شکل اختیار کرگئی تو وہ ہندی کی دنیا میں چار چاند لگانے لگے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی ادیب وفنکار انسانی معاشرے کا سچا ترجمان ہو جاتا ہے تو وہ پھر کسی خاص طبقے یا کسی خاص فرقے کی پسند نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی قبولیت ہر کس وناکس کے لیے ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کو جب کبھی متنازعہ فیہ بنانے کی مبینہ کوشش بھی کی گئی تو ہندستانی معاشرے نے اس سازش کو ناکام کردیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندستانی ادب کے قطب نما بن گئے۔ پریم چند کے ہم عصر چینی افسانہ نگار چھوؤ شوزن قلمی نام لوشن نے ایک بار کہا تھا کہ اگر ہندستان میں پریم چند کے بعد کوئی افسانہ نگار پیدا نہیں ہوتا تب بھی عالمی ادب میں ہندستان کو جگہ ملتی کہ پریم چند ہندستان میں پیدا ہوئے تھے۔ بلا شبہ آج عالمی ادب میں جن چند تخلیقی فنکاروں کی بدولت مشرقی ادب کو وقار حاصل ہے ان میں پریم چند کی نمایاں حیثیت ہے۔ ان کی تخلیقات نے پوری دنیا کو اپنی طرف مخاطب کیا بالخصوص ان کی کہانیوں نے ایک طرف ہندستانیت کو جِلا بخشی تو دوسری طرف عالمی فنکاروں کو اپنا گرویدہ بنایا کہ ان کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات صرف تخیلی نہیں تھے بلکہ ہندستان کے حاشیائی افراد کی زندگی کے آئینہ دار تھے، اس لیے ہمیں پریم چند یاد ہیں کہ ان کو بھلانے کا مطلب ہوگا کہ ہم اُس تخلیقی فنکار کو فراموش کردیں گے جو انسانی معاشرے میں امن وسکون، مذہبی رواداری، بھائی چارگی، جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت، عورتوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف جنگ اور سماجی مساوات کے لیے فکری ونظری صف بندی کے علمبردار تھے۔ اردو ادب کے قد آور ناقد اور ماہرِ پریم چند پروفیسر قمر رئیس نے اپنے ایک مضمون 'پریم چند کی روایت اور معاصر اردو فکشن' میں لکھا تھا:

پریم چند سے پہلے بھی ہماری فکشن کی دنیا آباد تھی لیکن وہ فکشن خوابوں کی دنیا پر مبنی تھی۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ کھانی اس طبقے کی ہوتی تھی جس طبقے کو سماج کی اکثریت نے کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔ جن اور پریوں کی کھانی سے اگر نجات ملی تو پھر محلوں کے راجائوں اور رانیوں کی داستان ہمارے فکشن کی روح بن گئی ۔ پریم چند نے پہلی بار فکشن کے ذریعے ہندستانی سماج کی حقیقی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہے۔

> ''پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندستانی گاؤں کے کسان، کھیت مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے، انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعت اور ایک نئے احساسات وجمال سے آشنا کیا۔ اس طرح اردو ادب جواب تک شہر کے اعلا اور متوسط طبقے کی ترجمانی کرتا تھا، سارے ملک کی متحرک زندگی، عوامی تحریکوں، سماجی آویزشوں اور عام انسانوں کے مشغلوں اور معرکوں کا جاندار مرقع بن گیا ہے۔''
>
> (منہاجِ پریم چند۔ ص:19)

حقیقت بھی یہی ہے کہ پریم چند سے پہلے بھی ہماری فکشن کی دنیا آباد تھی لیکن وہ فکشن خوابوں کی دنیا پر مبنی تھی۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ کہانی اس طبقے کی ہوتی تھی جس طبقے کو سماج کی اکثریت نے کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔ جن اور پریوں کی کہانی سے اگر نجات ملی تو پھر محلوں کے راجاؤں اور رانیوں کی داستان ہمارے فکشن کی روح بن گئی۔ پریم چند نے پہلی بار فکشن کے ذریعے ہندستانی سماج کی حقیقی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہے۔

ظاہر ہے کہ پریم چند کے تخلیقی سفر سے پہلے فرانسیسی انقلاب، صنعتی انقلاب اور روس کی بدلتی سیاسی فضا، مارکسی نظریے کی اشاعت سے عالمی ادب کے محور ومرکز میں تبدیلی شروع ہو چکی تھی اور اس کی آہٹ ہندستان تک پہنچ چکی تھی، لیکن غلام ہندستان میں چاہ کر بھی کوئی ادیب یہ جوکھم نہیں لینا چاہتا تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف متحرک ہو۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ غلام ہندستان میں صرف انگریزوں کا خوف ہی نہیں تھا بلکہ اس وقت کا جو سماجی نظام تھا اور بالخصوص ہمارے سماج میں جو جاگیرداروں کی جابرانہ بالا دستی تھی اس سے بھی انقلابی چنگاری شعلہ بننے سے رہ جاتی تھی، لیکن پریم چند نے اس خوف سے نکل کر اپنی تخلیقی دنیا آباد کی۔ سماج کے اس حاشیائی طبقے کو ہیرو بنانے کی پہل کی جس کے سایے سے بھی ہمارا سماج دور رہنا چاہتا تھا۔ دلت طبقے کی اذیت ناک زندگی، کسانوں کی بدحالی، عورتوں کے استحصال، غلط سماجی رسم ورواج کی وجہ سے متوسط طبقے کی پریشان کن زندگی کو کہانیوں کا موضوع بنایا اور ایک نئی فکر کی قندیل روشن کی۔ 'سوزِ وطن' سے لے کر 'واردات' تک کی کہانیوں میں پریم چند کا مشن صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشن کے لیے شعوری کوشش لازمی ہوتی ہے اور پریم چند نے شعوری طور پر اپنے عہد کے خوابیدہ اور دم توڑتی انسانیت کو بیدار کرنے کا ذمہ اپنے سر لیا۔

واضح ہو کہ وہ شروع سے اصلاح پسند تھے، اس لیے وہ آریہ سماج سے جڑے تھے اور جب مہاتما گاندھی نے ہندستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی برائیوں کے خلاف آواز بلند کی تو ان کی آواز پر نہ صرف لبیک کہا بلکہ آخر عمر تک گاندھی کے فکر وفلسفے کے علمبردار بن کر رہے۔ گاندھی جی کی تحریک سے پہلے ہی پریم چند ایک محبِّ وطن اور سماجی مصلح کے طور پر اپنی پہچان بنا چکے تھے کہ 1908 میں 'سوزِ وطن' کی اشاعت کے بعد ہی ملک گیر سطح پر ان کی مقبولیت عام ہو چکی تھی۔ گاندھی جی 1915 میں افریقہ سے ہندستان لوٹے اور جنگِ آزادی کی مشعل لے کر نکل پڑے۔ پریم چند جو پہلے سے ہی انگریزی حکومت کے خلاف تخلیقی جنگ لڑ رہے تھے انھیں گاندھی کی توانا آواز نے گرویدہ بنا لیا۔ گاندھی جی سے پریم چند کی پہلی ملاقات 8 فروری 1921 کو گورکھ پور میں ہوئی تھی۔ گاندھی جی انگریزوں کے خلاف تحریک عدمِ تعاون کا آغاز کر چکے تھے۔ گاندھی جی سے پہلی ملاقات میں ہی پریم چند نے ایک تاریخی قدم اٹھایا کہ انھوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور مہاویر پرساد پودار کے تعاون سے کھادی کو فروغ دینے کے لیے متحرک ہوگئے۔ اگرچہ اس مشن میں وہ ناکام رہے کہ جلد ہی مہاویر پرساد پودار ان سے الگ ہوئے اور چرخہ اور کھادی کی تجارت میں خسارے کا بوجھ وہ برداشت نہیں کر سکے اور پھر وہ اپنے گاؤں لمہی (بنارس) لوٹ آئے جہاں آخری سانس تک رہے۔ ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722